بسم اللہ الرحمن الرحیم

زندگی کا مقصد کیا؟

مفتی محمد سعید خان

نام کتاب : زندگی کا مقصد کیا؟

مصنف : حضرت مولانا مفتی محمد سعید خان مد ظلہم العالی

تاریخ اشاعت : ۲۰ رجب ۱۴۱۶ھ بمطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۹۵ء

اشاعت اول : دسمبر ۱۹۹۵ء

تعداد : ایک ہزار

ناشر : ندوۃ المصنفین

اشاعتِ خاص : (پی ڈی ایف) (پیشکش ادارہ ایقان، ایف ٹن ٹو، اسلام آباد)

تاریخ اشاعت : 11 جولائی 2020ء

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
1	غور کیجئے	04
2	بقائے اصلح	05
3	جواز بقا	06
4	وسائل اور مقاصد	07
5	شقیق بلخی اور ابراہیم ادہم رحمہم اللہ	08
6	اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشی	09
7	الفاظ اور حقائق	10
8	قدیم و جدید نسلوں کا باہمی موازنہ	12
9	معاشرے کا انحطاط	13
10	تعلیم	15
11	معیشت	17
12	جہاد	20
13	اخلاقیات	24
14	مسئلے کا حل	28

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غور کیجئے

آپ اپنے گرد و پیش کی اشیاء پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو با مقصد پیدا کیا ہے۔ اس کی ذات مقدسہ اس عیب سے پاک اور بلند و بالا ہے کہ کوئی فضول کام کرے۔ آسمان، زمین، سورج، چاند اور ستارے ہر ہر جسم سے اس کائنات کے منافع وابستہ ہیں۔ ہوا اور پانی پر زندگی کا دارومدار ہے۔ مٹی میں نمو ہے، کیسے کیسے گل و گلزار پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں فنا کی صلاحیت بھی پوشیدہ ہے کہ بڑی بڑی عظیم الشان عمارات اور تہذیب و تمدن کی علامات مل کر خاک ہو جاتی ہیں۔ لوہے میں بقا کا سامان ہے، قومیں اس کے ذریعے اپنا دفاع کرتی ہیں عالم اسباب میں جہاد آج تک اس کے بغیر برپا نہیں ہوا، نباتات انسانوں اور جانوروں کی بھوک مٹاتی ہیں جانوروں سے کام و دہن کی لذت اٹھائی جاتی ہے۔ الغرض آپ کسی بھی چیز کو اٹھا کر دیکھ لیجیے قدرت نے اس میں منافع رکھے ہیں، اس کی تخلیق کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے اور وہ بے کار پیدا نہیں کی گئی یہاں تک کہ بچھو کے ڈنک اور سانپ کے زہر میں بھی ایک مقصدیت ضرور کار فرما ہے۔ اشیا کے با مقصد و نافع ہونے کی حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد اس بات پر غور کیا جانا بھی ضروری ہے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ ہمیں اور آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ار اس عالمِ رنگ و بو میں بھیجا تو اس کی غرض و غایت کیا تھی؟ جس کائنات کے ذرے سے لے کر آفتاب تک ہر ہر چیز میں کوئی نہ کوئی حکمت و مصلحت کار فرما ہو کیا اس میں انسان جیسی عظیم مخلوق بے کار پیدا کی گئی ہے؟ جس انسان کو خلافت سے سر فراز فرمایا گیا اور ایسی امانت اس کے سپرد کی گئی جسے زمین و آسمان اور پہاڑوں نے اٹھانے سے بے بسی کا اظہار کر دیا تھا[1] کیا اس وجود کی تخلیق میں کوئی مقصدیت کار فرمانہ تھی؟ بس اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ ہمارا مقصد تخلیق کیا تھا؟

---

[1] یہ اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اُس فرمان کی طرف جو پارہ 22، سورہ احزاب آیت نمبر 72، میں بیان فرمایا ہے کہ ہم نے امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی سو سب نے اس کے (اٹھانے) سے انکار کیا کہ اے اسے اٹھائیں اور اس سے ڈرے اور اسے انسان نے اپنے ذمہ لے لیا۔ یہاں امانت سے مراد خلافت دنیوی و تجلی ذاتی کی استعداد و قابلیت ہے

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ربانی ہے۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَٰكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ﴿سورۃ المؤمنون، آیت نمبر ۱۱۵﴾

ہاں تو تمہارا خیال (یہ) تھا کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بغیر مقصد پیدا کر دیا ہے اور تم ہمارے پاس لوٹ کر نہ آؤ گے۔

ایک دوسرے مقام پر اس حقیقت کی طرف یوں متوجہ کیا گیا ہے۔

أَيَحْسَبُ ٱلْإِنسَٰنُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ﴿سورۃ القیامۃ، آیت نمبر ۳﴾

کیا انسان اس خیال میں ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟

ان آیات میں اس بات کی شدت سے نفی کی گئی ہے کہ انسان بے کار پیدا کیا گیا ہے اور اس کی پیدائش کا کوئی مقصد نہ تھا۔ اور اسے اپنے اعمال و کردار کا کوئی حساب و کتاب کسی کو نہیں دینا۔ یقیناً اس کی تخلیق میں مقاصد و منافع کار فرما ہیں اور جب تک انسان اپنی تخلیق کے اس مقصد کو نہیں پالیتا تب تک وہ خود اپنی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ یہ اصول ہے کہ ہر چیز کی قدر و قیمت اس مقصد کے اعتبار سے متعین ہوتی ہے جس مقصد کے لئے اس چیز کو بنایا گیا ہے۔ اگر وہ چیز اس مقصد کو پورا کرے تو یہ تکمیل کار اس کے مقام اور قیمت کا تعین کرتی ہے۔ مثلاً یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص بھینس کو اس لئے خریدتا اور خدمت کرتا ہے کہ دودھ حاصل کرے جب تک یہ بھینس دودھ دیتی رہے گی اپنی بقا کا جواز بھی فراہم کرے گی اور اپنی قیمت کا تعین نفع کی نسبت سے کروائے گی اور جب یہ دودھ دینا چھوڑ دے گی تو وہ مقصد جس کے لئے اس کی خدمت اور بقا ضروری تھی، ختم ہو جانے پر قصاب کے حوالے کر دی جائے گی۔ اشیاء کا اعتبار ہمیشہ مقصد کے تحت ہوا کرتا ہے۔ ایک شخص یہ چاہے کہ پانی گرم کرے اور آگ کے حصول کے لئے کسی بھی علم و فن کی ایک کتاب کا ایک ایک صفحہ اس برتن کے نیچے جلاتا رہے تو پانی تو یقیناً اس طرح بھی گرم ہو جائے گا مگر کتاب جس مقصد کے لئے لکھی گئی تھی وہ مقصد ضرور فوت ہو جائے گا۔

بقائے اصلح

یہی حال انسان کا بھی ہے کہ اگر وہ اپنے مقصد کے مطابق کام کرے گا تو وہ باقی رہے گا اور اگر اس سے ہٹ جائے گا تو پھر اس کی زندگی بے کار اور اعمال بے وزن ہو جائیں گے۔ قدرت کا قانون ہے کہ جو فرد یا قوم صحیح مقصد کے مطابق چلتی ہے اسے بقا کی ضمانت دی جاتی ہے اور جو اپنے مقصد کو فراموش کر دے یا اس ڈگر کو تبدیل کرے جو مقصد تک پہنچاتی ہے تو پھر اس کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی بقائے اصلح (Survival of the FITTEST) کا قانون شریعت اور عقل ہر ایک کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

فَأَمَّا ٱلزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ ٱلنَّاسَ

جو جھاگ (پانی پر اور مختلف دھاتوں کو پگھلاتے وقت اوپر کی

فَيَمْكُثُ فِي ٱلْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ ٱللَّهُ ٱلْأَمْثَالَ
﴿سورۃ الرعد،۱۷﴾

سطح پر آتا ہے) وہ نکما ہو کر اتر جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع دیتی ہے وہ دنیا میں رہ جاتی ہے اسی طرح اللہ مثالیں دیکر اپنی بات سمجھایا کرتا ہے۔

ہماری زندگی کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ بات ہمیں معلوم ہے ؟ اگر معلوم ہے اور ہم اس کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں، شب و روز اس مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہیں تو ہمیں یہاں زندہ رہنے کا حق حاسل ہے ہم سے زیادہ خوش قسمت فرد یا قوم دنیا و آخرت میں کوئی نہین لیکن اگر ہم اپنے مقصد کے مطابق کام نہیں کر رہے تو پھر اس زمین کا بوجھ ہیں جسے بہت جلد دور ہو جانا چاہئے۔ ہمیں اس کائنات کی سلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا بھی کوئی حق حاصل نہیں اور ہمیں جلد یا بدیر مٹنا پڑے گا اور وہ افراد اور اقوام آگے بڑھ کر کام کریں گے جو اپنے مقصد حیات کو پہچانتے ہوں اور اپنی قدر و قیمت کو خود منوا سکیں۔ جن افراد و اقوام میں اپنے وجود کو خود منوانے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہ محض اپنے ماضی کے قصے سنا سنا کر باقی رہنے کا حق حاصل کرنا چاہتی ہیں زمانہ ان کا ساتھ نہیں دیا کرتا۔ یہاں تو مقصد کے مطابق کام کر کے اپنا وجود تسلیم کرانا اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا ضروری ہے تا کہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ ہمیں کیوں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے ؟ وگرنہ وقت کی دوڑ اتنی تیز ہے کہ جو اپنے مقصد کے خلاف کام کرے گا یہ چکی اسے ردی اور بے کار ثابت کر کے باہر اٹھا پھینکے گی۔

جواز بقا

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہم مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق " مثنوی" سے ایک قصہ باختصار نقل کرتے ہیں۔ [2] قصہ یوں ہے کہ ایک اونٹ، بیل اور دنبہ کہیں جا رہے تھے اور تینوں کو بھوک تنگ کر رہی تھی ایک مقام پر اچانک انہیں گھاس کا ایک پولہ نظر آیا اور وہ تینوں للچائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے مگر اس مشکل میں پڑ گئے کہ گھاس تھوڑی ہے اور کھانے والے تین ہیں اگر تقسیم کریں تو سب بھوکے رہ جائیں گے اور اگر کھانے کو ملے تو کس کا حق بنتا ہے ؟ دنبے نے اس معمے کے حل کے لئے بات شروع کی اور جناب رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا تذکرہ کیا جس میں بڑی عمر والوں کا زیادہ حق ماننے کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ ثابت کیا کہ ہم تینوں میں سے جس کی عمر زیادہ ہو اسے یہ گھاس کھانے کا حق حاصل ہے۔ اونٹ اور بیل نے دنبے سے پوچھا کہ تیری عمر کیا ہے ؟ تو اس نے شیخی بھگاری کہ میری عمر کا دوستوں کیا پوچھتے ہو تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے فدیے میں ایک دنبہ ذبح کیا گیا تھا تو میں اور وہ، دونوں ایک ہی چراہ گاہ میں چرا کرتے تھے۔ یہ بات سن کر بیل بہت پریشان ہوا کہ یہ تو بہت دور کی کوڑی لایا ہے اب میں اپنی عمر اس سے زیادہ کیسے ثابت کروں ؟ پھر اس کو جو سوجھی تو کہنے لگا یارو تم جانتے ہو کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر اتارے گئے تو یہاں آکر انہوں نے کاشت کاری

[2] حصہ ششم ، صفحہ ۲۳۱

شروع کی تھی۔ ان کے ہل میں دو بیل جتے تھے جن میں سے ایک تو مر گیا اور دوسرا میں ٹھوکریں کھانے کو ابھی تک زندہ ہوں۔ یہ کہہ کر دل میں بہت خوش ہوا کہ دنبے سے تو زیادہ عمر بتلائی ہی ہے اونت بھی کیا یاد کرے گا اور اب اپنے آپ کو کتنی زیادہ عمر کا ثابت کرے گا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا اونٹ نے دونوں کی بڑ سن کر کچھ کہے بغیر گھاس کا وہ پولہ اٹھالیا اور اسے بلند گردن سے اتنا اونچا لے گیا کہ دنبہ اور بیل منہ دیکھتے رہ گئے پھر کہنے لگا میرے دوستو مجھے نہ تو بحث کی ضرورت ہے اور نہ تاریخ دہرانی ہے۔ نہ اپنی سوانح عمری بتانے کا قائل ہوں اور نہ عمر ہی کے کم یا زیادہ ہونے کے چکر میں پڑتا ہوں اگر یہ اول درست ہے کہ کسی بھی مقصد کے حصول کے لئے اپنی قوت اور طاقت منوانا پڑتی ہے اور اپنا حق ثابت کرنا پڑتا ہے اور عقل کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ یہ اصول درست ہے تو پھر تم میرے جسم اور عالی شان گردن کو دیکھو تم جس بل بوتے پر اپنا حق گھاس کے اس پولے پر ثابت کر رہے ہو اس کی بنیاد تو تاریخ ہے اور جس وجہ سے میں ثابت کر رہا ہوں اس کی بنیاد موجودہ حالت ہے تو تاریخ کو موجودہ حالت کے مقابلے میں کون قابل اعتنا سمجھتا ہے؟ تم اگر موجودہ حالت میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تو تمہارا شاندار ماضی تمہیں اب کوئی نفع نہیں دے سکتا اور یہ کہہ کر وہ گھاس ہڑپ کر گیا۔

اسی بات کو علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ　　پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

سو جو فرد، قوم اور معاشرہ اپنے مقصد سے ہٹ جائے اور اپنی بقا کا استحقاق ثابت نہ کر سکے زمانہ خود اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

وسائل اور مقاصد

یہ تو بات اس فرد اور معاشرے کی ہے جنہیں اپنے مقصد حیات کا علم ہو اور وہ پھر اس کے خلاف کام کر رہے ہوں۔ لیکن جس قوم کو یہی خبر نہ ہو کہ وہ کیوں جی رہی ہے اور وہ اپنے مقاصد کو ہی نہ جانتے ہوں، ان کی تباہی اور ان کی پستی کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ ہمارا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟ یہ سوال تو بہت بعد کا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں؟ یہاں تو سرے سے مقصد ہی سے بے خبری ہے۔ اگر آپ کو اس بات کے ماننے میں تردد ہو تو آپ کچھ وقت نکال کر کسی کالج، یونیورسٹی دفتر یا شاپنگ پلازہ کے صدر دروازے (Main Gate) پر کھڑے ہو جایئے اور پوچھنا شروع کیجئے کہ آپ کیوں جی رہے ہیں؟ آپ کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ تو اول تو اکثریت ان سوالات ہی کو سمجھ نہیں پائے گی۔ کیونکہ انہوں نے اس بات کو سوچنے کی زحمت ہی کبھی گوارا نہیں کی اور اگر کوئی اس میدان میں جواب دے بھی پائے گا تو اس کی پرواز (۱) مال و دولت (۲)

عزت واقتدار اور (۳) عورت و نفس پرستی سے زیادہ بلند نہ ہو گی۔ شاید ہزار میں کوئی ایک فرد ایسا ملے جو جانتا ہو کہ وہ کیوں جی رہا ہے، اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور وہ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا محنت کر رہا ہے؟ زندگی جیسی عظیم چیز کو مندرجہ بالا تین باتوں کو ہدف و منزل بنا کر گزار دینا اور اپنی تمام تر صلاحیتں ان کاموں میں صرف کر دینا ایسا ظلم ہے جس کی جواب دہی آخرت میں تو ہو گی سو ہو گی دنیا میں مرنے سے پہلے اس کا خمیازہ اس فرد قوم اور معاشرے کو ضرور بھگتنا پڑے گا۔ خالص ریشم و کمخواب کی حسین و نفیس چادر کو کانٹوں کی باڑ پر رکھ کر کھینچ دیا جائے اور وہ تار تار ہو جائے تو یہ اتنا بڑا ظلم اور درندگی نہیں جتنا بڑا ظلم اور درندگی یہ ہے کہ انسان اپنے جینے کے مقصد سے بے خبر ہو اور پھر زندہ بھی رہے۔

مال و دولت، عزت و آبرو اور اپنی خواہشات کی جائز تسکین کی یکسر نفی کوئی عقلمند اور ذی شعور انسان نہیں کر سکتا مگر یہ حقیقت آخر کیوں نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے کہ یہ تمام اشیاء کسی خاص مقصد تک پہنچنے کے لئے وسائل اور ذرائع ہیں خود مقصود نہیں۔ آپ امسافر کی بد قسمتی پر کیسے ماتم کناں نہ ہوں جس نے اپنے سفر کا آغاز لاہور سے اس لئے کیا کہ وہ کراچی پہنچ سکے اور جب کراچی آئے تو وہ جہاز کی سیٹ سے چمٹ کر بیٹھ جائے اور بے جا ضد کرنے لگے کہ یہ سیٹ اسی کی ہے۔ حالانکہ یہ جہاز اور سیٹ تو کراچی پہنچانے کا ایک ذریعہ تھی مقصد تو کچھ اور تھا بس اسی طرح جب کوئی فرد اور معاشرہ ذرائع، اسباب اور وسائل کو وہ اہمیت دینے لگے جو مقاصد کو دی جانی چاہئے تھی تو پھر اس اندھے پن سے اسے کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔ وہ تمام عمر انہی اسباب و وسائل کے گرد کولہو کے بیل کی طرح گھومتا رہتا ہے رات دن اسی فکر میں رہتا ہے کہ دولت کیسے زیادہ ہو؟ عہدے کی دھاک کیسے بٹھائی جائے؟ اور اپنے نفس کی لذت و تسکین کے لئے کیا کیا ذرائع اختیار کئے جائیں؟ یہاں تک کہ وہ اس فکر سے بالکل محروم ہو جاتا ہے کہ یہ تمام اشیاء تو کسی مقصد تک پہنچنے کے لئے عنایت کی گئی تھی اور میں نے اپنی حماقت سے ان وسائل کو مقاصد کا درجہ دے دیا ہے حتیٰ کہ موت کا الارم بج جاتا ہے اور وقت ختم ہونے پر اس کے نہ چاہنے کے باوجود امتحان کے اس حال سے اسے جبراً الگ کر دیا جاتا ہے۔ موت کا خوف اس پر اس لئے بھی مسلط رہتا ہے کہ اس نے جن چیزوں کے ساتھ دل لگایا تھا اب وہ اس کے نہ چاہنے کے باوجود اس سے چھین لی جائیں گی اور مقصد کے خلاف زندگی گزارنے پر عتاب کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔

کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

حضرت شقیق بلخی اور حضرت ابراہیم ادہم رحمہم اللہ

" حلیۃ الاولیاء" میں ابو نعیم اصفہانی نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم اور حضرت شقیق بلخی رحمہم اللہ کی ملاقات مکہ مکرمہ میں ہوئی ابراہیم بن ادہم نے شقیق بلخی سے دریافت کیا کہ گزر اوقات کس طرح ہوتی ہے؟ تو انہوں نے

جواب دیا جب اللہ تعالیٰ کچھ دے دیتے ہیں تو ہم بھی کھا لیتے ہیں اور جب نہیں دیا جاتا تو صبر کرتے ہیں ابراہیم ادہم فرمانے لگے ہاں بلخ کے کتے بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ شقیق یہ سن کر کہنے لگے اور حضرت آپ کی گزر کیسے ہوتی ہے تو ابراہیم ادہم نے جواب دیا جب کچھ مل جائے تو ہم ایثار و قربانی سے کام لیتے ہیں (اپنے سے زیادہ ضرورت مند بھائی کو دے دیتے ہیں) اور جب کچھ نہیں دیا جاتا تو بھی شکر اور حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں۔

یہ سن کر شقیق اٹھ کھڑے ہوئے پھر ان کے مزید قریب ہو کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے میرے آقا در حقیقت استاد جو تربیت کرتا ہے وہ تو آپ ہی ہیں[3]۔ آپ غور کیجئے یہ دونوں اسی ایک جہاں میں رہتے تھے ایک ہی طرح کے حلیے اور شکل و صورت کے مالک تھے مگر ایک کی پرواز اور ذوقِ حیات کیا ہے اور دوسرے کی پرواز اور ذوقِ حیات کا معیار کیا ہے؟ رحمہا اللہ تعالیٰ جمیعاً

جو انسان اپنی زندگی کسی مقصد کے تحت گزارتا ہے وہ کسی نہج اور ڈگر کا پابند ہوتا ہے اور جس کی زندگی بے مقصد ہوتی ہے وہ محض اپنے نفس کے تابع ہوتا ہے اس کا نفس اسے عبادت کی تلقین کرے تو وہ ایک دن میں پورا قرآن پاک بھی تلاوت کر لیتا ہے، پوری رات نوافل کی نذر کر دیتا ہے خرچ کرنے پر آئے تو گھر لٹا دیتا ہے معافی کا رویہ ہو تو خون کے قاتل پناہ پا جاتے ہیں اور جب اس کا نفس اسے شر کی تلقین کرتا ہے تو کل تک جو جنید و شبلی دہر نظر آتا تھا آج شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے نفس کے کہے پر عمل کرنا اور حد سے گزر جانا بس انہی لوگوں کا خاصہ ہے جو بے مقصد زندگی گذارتے ہیں اور ان کا ہر عمل خیر و شر میں حدود (Limits) کا پابند نہیں ہوتا۔ اعتدال نام کی چیز وہاں ڈھونڈے سے نہیں ملتی اور بامقصد زندگی بسر کرنے والے اس بے اعتدالی سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔

اس دنیا کی آبادی اربوں میں شمار کی گئی ہے ہر مذہب و ملت کے لوگ بستے ہیں۔ ان کی زندگی کے مقاصد کیا ہیں ان مقاصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں وہ اپنے وسائل کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں یا نہیں پھر ان کی زندگیاں کامیاب و کامران ہیں یا نہیں ان تمام مباحث سے ہٹ کر سر دست اہم مسئلہ تو یہ ہے کہ ایک مومن انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کی زندگی کا مطمع نظر کیا ہونا چاہئے؟ اسے کس ہدف تک پہنچنا اور کس منزل کو حاصل کرنا ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک مومن انسان کی زندگی کا اصل اور واحد مقصد

اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشی

---

[3] ج، .8 صفحہ 37

کا حاصل کرنا ہے اور بس۔

الفاظ اور حقائق

" اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشی " لکھنے اور بولنے میں یہ محض پانچ الفاظ ہیں مگر ان کے پس پشت کیا کیا حقائق پوشیدہ ہیں اور اس عمیق و اتھاہ سمندر میں غوطہ زنی کے لئے کس قدر ہمت درکار ہے بس اس کا اندازہ انہیں کو ہو سکتا ہے جنہوں نے اس میدان میں قدم رکھا ہو یا اپنی زندگی کا یہ مقصد متعین کر کے پھر اس کے حصول کے لئے جدوجہد کی ہو۔ الفاظ اور حقائق کا کتنا گہرا تعلق ہوتا ہے اسکو اگر مثال سے سمجھنا مقصود ہو تو آپ یوں سمجھئے کہ عدالت یہ کہتی ہے کہ " فلاں شخص فلاں کا باپ ہے " ۔ چھ الفاظ پر مشتمل یہ جملہ اپنے اندر کتنے حقائق کو سموئے ہوئے ہے اس کا پہلا مطلب تو یہ ہے کہ عدالت نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ یہ لڑکا جس خاتون کے ہاں پیدا ہوا ہے وہ خاتون اس شخص کی بیوی قرار پائیں۔ دوسرا مطلب یہ ہوا کہ اس لڑکے کی پرورش کا بوجھ اور نان و نفقہ کی ذمہ داری اس شخص کے فرائض میں شامل ہے۔ اس کا تیسرا مطلب یہ ہوا کہ اس شخص کی دیگر اولاد اس لڑکے کے بہن بھائی قرار پائیں گے۔ چوتھا مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص اس لڑکے کی تعلیم و تربیت کا قانونی طور پر پابند ہے اور اس جملے کا پانچواں مطلب یہ ہوا کہ ان دونوں میں سے جو بھی پہلے انتقال کر جائے وہ دوسرے کی وراثت کا حق دار ہے۔ وغیرہ وغیرہ اب یہ کہنے کو ایک جملہ تھا مگر اس چھ الفاظ پر مشتمل صرف ایک جملے نے کتنے حقوق و فرائض کا تعین خود بخود کر دیا۔ بس بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشی کا حصول کہنے کو صرف ایک فقرہ ہے مگر مومن کا مقصد حیات ہے اور اس کی تمام زندگی کا اصل محور و مرکز بس صرف اور صرف یہ ایک ہی بات ہے۔ اسی کے حصول کے لئے تمام تگ و دو کی جاتی ہے اور سارے پاپڑ اسی لئے بیلے جاتے ہیں کہ یہ "مقام رضا" نصیب ہو۔

قرآن کریم میں مومن کی زبان سے اسی بات کا اقرار کروایا گیا ہے کہ وہ ڈنکے کی چوٹ، کھلے بندوں اور علی الاعلان کہے کہ۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِيكَ لَهُۥ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا۠ أَوَّلُ ٱلْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾ سورۃ الانعام

بلا شک و شبہ میری نماز اور میری ہر طرح کی عبادت ار میری زندگی اور میری موت صرف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی (مقصد کے تحت زندگی گزارنے) کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کا فرمابردار ہوں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کا اسوہ حسنہ قابل اتباع اور جن کی زندگیاں مشعل راہ ہیں ان کی حالت یہی بیان کی گئی ہے کہ۔

تَرَىٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا (سورۃ الفتح. آیت نمبر. 29)

تم انہیں جب دیکھو گے رکوع اور سجدے اور اللہ کا فضل اور اسکی رضا و خوشی کی طلب میں مصروف پاؤ گے۔

مومن کی زندگی کا مقصد رضائے باری تعالیٰ ہی کا حصول جب ٹھہرا تو ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے سب سے بلند جس مقام اور آخری منزل کی خبر دی گئی تو وہ بھی مقامِ رضا ہی تھا کہ اس سے بلند و بالا کسی مرتبے کا تصور ممکن نہیں۔ انہوں نے اپنے مقصد حیات کے لئے جان کھپادی اور زندگی لگادی اسی لئے مالک حقیقی نے جب ان سے اپنی رضا و خوشی کا اعلان فرمایا تو انہیں ان الفاظ میں یہی نوید سنائی کہ تم اپنی زندگی کے مقصد میں کامیاب ہوئے اور تمہیں ہماری رضا نصیب ہوئی۔

الَّذِينَ ءَامَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَٰهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُونَ ﴿٢٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَٰنٍ وَجَنَّٰتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ﴿٢١﴾ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُۥٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٢﴾ سورۃ التوبہ

جو لوگ ایمان لائے اور اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی اور پھر اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اللہ کے ہاں تو انہی لوگون کا بڑا درجہ ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں ان کا پروردگار انہیں اپنی رحمت اور رضا و خوشی کی بشارت دیتا ہے اور ایسی جنتوں کی جہاں مستقل خوشی کے سامان ہوں گے اور یہ ان میں ہمیشہ رہیں گے بے شک اللہ کے پاس ان کاموں کا صلہ دینے کے لئے بہت کچھ ہے۔

اور یہ "مقام رضا" کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کے لئے مخصوص نہ تھا قرآن پاک کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی اگر کوئی شخص اپنی زندگی کا یہ مقصد بنا کر اس کے لئے حتی الوسع جدوجہد کرے تو ذات باری تعالیٰ اسے اسی مقامِ رضا سے سرفراز فرمائے گی[4]۔ سورہ توبہ میں ارشاد ربانی ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَٰتِ جَنَّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا وَمَسَٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّٰتِ عَدْنٍ ۚ وَرِضْوَٰنٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۷۲﴾

اللہ کا وعدہ ہے ان مومن مردوں اور عورتوں سے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے درمیان میں نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور ان سدا بہار باغات میں ان کے لئے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشی و رضا انہیں حاصل ہو گی یہی بڑی کامیابی ہے۔

ان تمام آیات اور متعدد دیگر تصریحات سے اکابرین امت جو کچھ سمجھے ہیں وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشی ہر کام میں مد نظر رہے بس مومن کی زندگی کا مقصد یہی ہونا چاہیئے اس کی زندگی کی تمام کاوشیں دنوں کی تمام جدوجہد اور راتوں کی تمام تگ و تاز حتیٰ کہ حیات مستعار کا نچھاور کر دینا بس صرف اور صرف اُن کی خوشی اور رضا کے حصول کے لئے ہونا چاہیے۔

مندرجہ بالا سطور میں مومن کا مقصد حیات جو بیان کیا گیا ہے اگر وہ درست ہے اور یقیناً درست ہے تو ہمیں ایک بار یہ جائزہ بھی لینا چاہیے کہ کیا آج ہم اس مقصد سے آشنا ہیں؟ اگر ہیں تو کیا ہم اپنی زندگیاں اس مقصد کے حصول کے لئے صرف کر رہے ہیں؟ اگر ہم مقصد شناس تو ہیں مگر عمل میں کوتاہی ہے تو یہ ایک جرم ہے اور اگر سرے سے مقصد ہی سے بے خبر ہیں تو یہ

---

[4] یہ خیال رہے کہ صرف مقام رضائے باری تعالیٰ کی بات ہو رہی ہے نہ مقام و شرف صحابیت کی کہ اس میں کسی کا ان کے بعد شریک و سہیم ہونا ناممکن ہے رضی اللہ عنہم جمیعاً اور دوسرے یہ مقام رضا بھی ان حضرات رضی اللہ عنہم کے لئے قطعی تھا البتہ بقیہ امت کے لئے ظنی طور سے ثابت ہو سکتا ہے۔

دوہرا جرم ہے ہم سنبھل جائیں اور اس غفلت کا تدارک کرلیں وگرنہ مکافات عمل کے عالمگیر قانون سے استثناء محض خام خیالی اور خوش فہمی ہے۔

قدیم وجدید نسلوں کا باہمی موازنہ

ہم سے پہلے کی نسلیں ہم سے زیادہ پاکیزہ، بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کی مالک تھیں اس بات سے اتنا فرق نہیں پڑتا جتنا اس بات سے فرق پڑتا ہے کہ ہمارا معاشرہ کیسے افراد تیار کر رہا ہے۔ اچھے لوگ جو بامقصد زندگی کے داعی ہوتے ہیں قدرت کا انعام ہے جو وہ اپنے بندوں پر نچھاور کرتی ہے اور جب ان کی مسلسل ناقدری ہونے لگے اور قومیں ان کے وجود سے فائدہ نہ اٹھائیں تو پھر اس انعام کا دروازہ بند بھی ہو جایا کرتا ہے۔ معاشرے سے جو نئی قیادت ابھر کر سامنے آرہی ہے اس کا عادات و اطوار کا عالم یہ ہے کہ ان میں ضبط کی صلاحیت مفقود ہے۔ ادنی سے ادنی بات اگر ان کے مزاج اور طبع کے خلاف ہو تو وہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ذرائع ابلاغ انہیں اتنا مشتعل کر رہے ہیں کہ وہ ایک لمحے میں فتنہ وفساد کی آگ پکڑ لیتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد رضائے الٰہی تو کیا ہوتا وہ تو انسانیت اور تہذیب کی حدود عبور کرنے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ انہیں اپنی طبیعت پر کنٹرول نہیں۔ جوانی پر قابو نہیں اور پھر مال و دولت کی فراوانی کو اللہ کا انعام سمجھ کر اس کی قدر تو کیا کرتے اس کی بجائے وہ اسے اعلیٰ سے اعلیٰ سامانِ آرائش و زیبائش اور عیاشیوں کے جہنم میں جھونک رہے ہیں۔ معاشرے کو یہ اندرونی بیماریاں گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں اور جو نسل سامنے آرہی ہے وہ قومی مفادات پر ذاتی مفادات کو ترجیح دینے والی ہے ایسی نسل سے اچھائی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ بامقصد زندگی سے کوسوں ہٹ گئے ہیں اور وہ جدوجہد جو قوموں کی بقا کے لئے ضروری ہوتی ہے، اخلاص اور مردانگی جس کے اہم اجزاء ہوتے ہیں اس کے علمبردار کھو گئے ہیں۔ کیا ہمارے اسلاف ایسے ہی تھے؟ کیا کوئی ایک خوبی بھی ایسی ہے جس میں ہم اس سے آگے بڑھ گئے ہیں؟ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے دور میں دو نسلوں کا موازنہ کیا تھا جو آج بھی ایسے تروتازہ ہے کہ گویا وہ ان حالات کو ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح دیکھ کر یہ نقشہ کھینچ رہے تھے۔ نصف صدی سے زائد عرصہ بیت گیا مگر زمانے کی کوئی گرد اس موازنے کو اپنی آلودگی کی لپیٹ میں نہیں لے سکی[5]۔

ہر کوئی مست مئے ذوق تن آسانی ہے — تم مسلمان ہو؟ یہ انداز مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے نہ دولت عثمانی ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

---

[5] کلیات اقبال، بانگ دراء، زیر عنوان جواب شکوہ، صفحہ : 203

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم — تم خطا کار و خطابین وہ خطا پوش، کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم — پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم

تخت فغفور بھی ان کا تھا سریر کے بھی
یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی

خود کشی شیوہ تمہارا وہ غیور و خوددار — تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا وہ سراپا کردار — تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بکنار

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت انکی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی

معاشرے کا انحطاط

بامقصد و باعمل زندگی تو درکنار عقائد تک میں اضمحلال ہے۔ اللہ تعالی پر بھروسہ، اس سے رحمت کی امید، اس سے درگزر کی توقع، آخرت میں جواب دہی کا احساس، قبر، حشر اور نامہ اعمال کے ملنے کا یقین، تقدیر پر ایمان اور مصائب و تکالیف کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے اوصاف جس معاشرے میں بھی ہوتے ہیں وہ کبھی اتنا بانجھ نہیں ہوا کرتا جتنا کہ آج ہمارا معاشرہ ہو چکا ہے۔

اخلاقیات کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ ہم نام نہاد مسلمانوں کا کردار معاملات اور اخلاقی قدروں کے بارے میں اس قدر حوصلہ شکن ہے کہ کافر کردار کے معاملے میں مثال اور ہم بدنام کنندہ ہوتے جارہے ہیں۔ حسد، کینہ ریاکاری بغض، بخل، غیبت، بہتان تراشی فضول اور بے کار کاموں میں دلچسپی لاحاصل بحث جھوٹی انا اور اس کی تسکین کے لایعنی حربے آخر کون سی برائی ہے جو ہم میں نہیں ہے؟ اور کیا ان تمام باتوں کو ایک مومن کی بامقصد زندگی سے کوئی ادنی درجے کی بھی مناسبت ہے؟ اسلاف سراپا کردار اور عمل تھے اور ہم ان کے نالائق جانشین محض ان کے قصے سنانے اور گپیں ہانکنے والے بھی اس وقت تک تھے جب تک کہ ہمارا علم اور مطالعہ ان کے بارے میں تھا اور جس دن سے علوم کی جگہ فنون، تعمیر کی جگہ تخریب اور آگاہی کی جگہ غفلت نے لی ہے ان کے کارناموں کا ذکر خیر بھی مٹ کر رہ گیا ہے۔ آپ عام عوام میں جاکر پوچھیے کہ صلاح الدین ایوبی کون تھا، رچرڈ کے ساتھ اس کا سلوک کس اعلی ظرفی کا مظاہرہ تھا، معرکہ حطین کیا تھا؟ سقوط بغداد اور غرناطہ کی تباہی کا سانحہ کیوں کر بیتا؟ ابو حیان نے کیمیا میں کیا کیا؟ الشفاء اور القانون نے طب کی دنیا کو کیا دیا؟ ابن خلدون کے مقدمے نے تاریخ میں کیا ہر علم و فن میں کیا تہلکہ برپا کیا؟ معتصم کو صرف ایک مسلمان خاتون نے ایک عیسائی مرد کی زیادتی پر ہزاروں میل دور سے پکار کر کہا

"وامعتصماہ" ہائے معتصم تیری دھائی ہے اور معتصم نے "عموریہ" کو کس سلطنت میں داخل کر دیا کس قدر غیور مسلمان حکمران تھے ؟ فارابی کندی اور بو علی سینا کس امت میں پیدا ہوئے ؟ عزالدین بن عبد السلام، امام نووی، حافظا ابن حجر، عینی اور ابن ہمام کون تھے ؟ یہ تو چھوڑیے کہ دور کی بات ہے آپ یہ پوچھ دیکھیے کہ ہمیں آزادی کیوں کر ملی ؟ جبر واستبداد کی سیاہ رات کیسے کٹی ؟ حریت کی سحر کیسے طلوع ہوئی ؟ امیر المؤمنین سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک اور ان کے رفقاکار کون تھے ؟ مولانا جعفر تھانیسری پر کالا پانی میں کیا بیتی ؟ مالٹا میں حضرت شیخ الہند اور مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہما کس جرم میں پابہ زنداں رہے ؟ کتنی تمناؤں کتنی قربانیوں اور کتنی آہوالتجا کے بعد "پاکستان" کے نام سے ایک ٹکڑا کیسے حاصل ہوا، اس کی اصل تاریخ کیا ہے ؟ پھر یہ ارض مقدس حاصل ہو جانے کے بعد مستحکم معیشت، صحیح نظام ارزاں و فوری انصاف کی ضامن عدلیہ اور وہ مقاصد جن کے لئے یہ خطہ حاصل کیا گیا تھا ان کے حصول کے لئے کون تھے جو پابند سلاسل ہوئے تو انہوں نے اپنے خون سے "زنداں نامہ" رقم کیا۔

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر تیرے رخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفت سایہ و دیوار و در میں جیتے ہیں

اس کو بھی لپیٹ رکھیے ان سے پوچھیے جنہیں اپنے "پڑھا لکھا" ہونے پر ناز ہے کہ مارکس کے سحر میں کیا تھا جس سے لاکھوں خاندان برباد ہوئے ؟ ہیگل کے نام پر کیوں کلب (Clubs) کھلے اور اس کی تعلیمات کیا تھیں ؟ کانٹ نے کس علم کے کس شعبے کو کیا دیا ؟ ہر طرف ہو کا عالم ہے۔ جہالت کا غلبہ ہے۔ ان سوالات کا جواب اس پوری نسل کے 5 فیصد کو بھی معلوم نہیں موسیقی کی دھنیں انہیں یاد ہیں فلمی دنیا سے مکمل شناسائی ہے نفس پرستی ہے جذباتی فیصلے ہیں اپنے ناصح سے زیادہ گیر پر اعتماد ہے جس نسل کو کچھ دینا چاہئے تھا وہ کیا دے رہی ہے اور جس نسل کو کچھ لے کر مستقبل کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے طیار ہونا چاہئے تھا وہ کیا لے رہی ہے اگر آپ حقیقتاً تجزیہ کریں تو بجز إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھنے کے اور کیا کہا جا سکتا ہے ؟

کیا کسی مومن کی بامقصد زندگی اتنی بے مصرف ہو سکتی ہے ؟ ہمارے اسلاف چاند تک نہیں پہنچے مگر انہوں نے اس زمین پر ہر دور میں انسانیت کو سینکڑوں چاندوں کی ٹھنڈی چاندنی دی، سکون وراحت کی زندگی دی۔ جہالت و غربت کا خاتمہ کیا وہ مکھیوں کی طرح اڑے اور مچھلیوں کی طرح تیرے تو نہیں مگر انسان بن کر اس دنیا میں چلتے ضرور رہے۔ وہ کیا تھے اور ہم کیا

ہیں؟ کہاں وہ بامقصد زندگیوں کے حامل چلتے پھرتے انسان اور دورِ عروج اور کہاں یہ بے مقصد زمین کا بوجھ چلتی پھرتی لاشیں اور دور زوال۔

میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ! وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی حدف
تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چُکا میں موج موج، دیکھ چُکا صدف صدف[6]

تعلیم

آسمان سے پیغام آنا بند ہو چکے تھے انسانیت تاریکی میں ڈوب چکی تھی کوئی اس بحر ظلمت سے نکالنے والا نہ تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے چھ سو سال بعد روشنی کی پہلی کرن پھوٹی وحی نے اس شب دیجور کے پردے چاک کئے انسانیت کی رہنمائی کی اور پہلا لفظ جو اللہ نے اپنے بندوں سے ہم کلامی کے لئے اختیار فرمایا وہ اقراء (پڑھیے) جس امت کو پہلے دن سے پہلے لفظ کے ساتھ تعلیم و تعلم، درس و تدریس کے میدان سے منسلک کر دیا گیا ہو اس کے گھر کے آنگن میں یوں جہالت کے خیمے گڑ جائیں وہ بحثیت قوم تعلیم کے میدان میں اس بری طرح پٹ جائے کہ ان کے تمام مہرے اس بساطِ علم میں مات کھا جائیں! اس بد قسمتی و کم نصیبی پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔

ہم اپنا اور اسلاف کا موازنہ اگر تعلیم میں کریں تو برصغیر میں خاندانِ غلاماں کے آخری بادشاہ غیاث الدین بلبن نے برصغیر میں تو تعلیم کو عام کیا ہی یہاں دہلی میں بیٹھ کر مکہ معظمہ میں مدرسہ تعمیر کروایا رمضان 814ھ میں جب اس مدرسہ کا افتتاح ہوا تو حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی چاروں مسالک کے علماء کو تعلیم کے لئے مقرر کیا گیا اور اس مدرسے کے تمام اخراجات بلبن یہاں سے مکہ معظمہ بھجواتا تھا۔

عباسی دور میں بغداد سے لے کر قرطبہ (سپین) تک ہر مسجد کے ساتھ ایک کتب خانے کا وجود ضروری قرار دیا گیا اور اس میں طب، جراحی، ادویہ سازی، ریاضی، منطق، جغرافیہ، تاریخ، ہیئت، ادب، فلسفہ، کیمیا، طبیعات، فلکیات، موسیقی، مصوری، حدیث، فقہ اور تفسیر کی مستند کتابیں دستیاب تھیں۔ حتیٰ کہ بغداد جب تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا تو اس وقت صرف بغداد شہر کے سرکاری کتب خانوں میں موجود کتابوں کی تعداد مورخین نے چار کروڑ بیان کی ہے۔ عام عوام کے ذاتی

---

[6] کلیات اقبال، بال جبرئیل، صفحہ 331

کتب خانے (Private Collocation) جو شرفاء کے ہاں بالعموم مل جاتے تھے اس کے علاوہ تھے۔ شہر کی ویرانی پر تاتاری فوج نے ان کتابوں کو دریائے دجلہ میں جب ڈالنا شروع کیا تو ایک مقام پر پل کی ضرورت ہی نہ رہی دریا کی تہہ سے لے کر سطح تک کتابیں ہی کتابیں تھیں اور فوج انہیں پر چل کر بغداد میں آتی جاتی رہی۔

مصر میں فاطمیوں نے جو کتب خانے قائم کئے ان میں سے صرف ایک کتب خانے ہی میں ہیئت، کیمیا، حدیث اور لغت پر سولہ لاکھ کتابیں موجود تھیں۔

اندلس میں امیر المؤمنین الحکم الثانی کے ذاتی کتب خانے میں چار لاکھ کتابیں تھیں جن کی فہرستیں باقاعدہ جب مرتب کی گئیں تو ان فہرستوں کی ہی چوالیس (44) جلدیں بن گئیں۔

اگر امت اور اسلاف میں تعلیم و تعلم کا رجحان نہ ہوتا تو کیسے اتنے عظیم الشان کتب خانے وجود میں آسکتے تھے؟ آپ تاریخ میں اتنا کیوں پیچھے جائیں آج بھی لندن میں ایسٹ انڈیا آفس کمپنی کی لائبریری میں موجود ان کتابوں، رپورٹوں اور مختلف شاہی فرامین کو جا کر دیکھیں جو انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں برصغیر سے انگلینڈ منتقل کئے تو ان میں لاکھوں قلمی نسخے ہیں، ایسی ایسی نایاب اور نادر کتابیں ہیں جنہیں ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو احساس ہوا کہ اسلاف اور اکابر کو علم سے کتنی محبت تھی اور آہ ان کے جانشین کس قدر کم ہمت نکلے ان کے علوم و فنون میں ترقی تو درکنار خود اس سرمایے سے بھی مستفید نہ ہو سکے۔ استنبول میں مکتبہ سلیمانیہ کا عظیم الشان غالباً واحد کتب خانہ ہے جو خلافت عثمانیہ کی وجہ سے یورپ کی دست برد سے محفوظ رہا اسے دیکھنے پر عقل حیرت زدہ ہوتی ہے کہ کبھی اس قدر علوم و فنون کی امین یہ امت مسلمہ بھی تھی۔ علامہ اقبال مرحوم جب یورپ سے واپس لوٹے تھے تو یہی رونا رویا تھا کہ [7]

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

[7] کلیات اقبال، بانگ دراء، زیر عنوان خطاب بہ نوجوانان اسلام، صفحہ، 180

یہ کتابیں، یہ تعلیم، یہ جامعات (Universities) یہ کتب خانے اس لئے تھے کہ ان اسلاف کی زندگیاں بامقصد تھیں۔ ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور خوش رکھنا تھا اور اس عظیم مقصد کے لئے انہوں نے علم کا راستہ اختیار کیا تھا۔ آج کیا ہماری نسلوں کا بھی یہی راستہ ہے؟ جنیں زندگی کے مقصد ہی کی خبر نہیں انہیں راستے سے کیا بحث!

آپ ٹھنڈے دل سے غور کیجئے ہمارے موجودہ معاشرے میں مطالعے کا رجحان کتنا ہے؟ ہمارے نوجوانوں کو علم سے کتنی مناسبت ہے؟ ہم اپنی آمدنی کا کتنا حصہ تعلم، کتابوں کے خریدنے اور تعلیمی اداروں کی مدد کے لئے صرف کرتے ہیں؟ جو کتب خانے مختلف شہروں کے سکول، کالج، یونیورسٹی یا نیشنل سینٹرز کے ساتھ ملحق ہیں وہاں آبادی کے تناسب سے لائبریری کی رکن سازی (Membership) کی نسبت کیا ہے؟ اگر ان سوالات کا جواب مایوس کن ہے تو پھر آخر کس برتے پر اللہ تعالیٰ اس دنیا کی قیادت اس امت کے سپرد فرمادے؟ اور اگر آپ اپنی زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشی و رضا کو حاصل کرنا قرار دے چکے ہیں، تو عالیشان منزل کے حصول کے لئے تعلیم کو وسیلہ اور سبب بنالیجئے اس میدان میں کام کیجئے۔

معیشت

معیشت کے میدان میں اسلاف کے لئے سب سے اہم مسئلہ ذرائع آمدن کا تھا کہ وہ جائز ہیں یا ناجائز؟ ان کا کھانا، پینا، تعمیر، لباس، تعلیم صدقات، زندگی کے تمام شعبوں میں خرچ ہونے والی رقوم، حلال ذرائع سے آرہی ہیں یا مشکوک ہیں۔ حرام کے تو وہ قریب جانا موت کا منہ سمجھتے تھے۔ خلیفہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے اپنی بیٹی ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو طلب فرمایا اور ان سے کہا جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں میں نے سرکاری خزانے سے مسلمانوں کا ایک دینار یا ایک درھم بھی کبھی نہیں لیا۔ ہاں پیٹ بھرنے کے لئے باریک نہیں موٹا آٹا لیتا رہا ہوں اور تن ڈھانپنے کے لئے باریک نہیں موٹا کپڑا البتہ لیا ہے۔ میں نے تو ان کے مال غنیمت میں سے بھی جو کہ سرکاری خزانے میں آتا ہے کبھی کچھ نہیں لیا نہ تھوڑا نہ بہت البتہ (۱) ایک حبشی غلام (۲) ایک پرانی چادر اور (۳) گھر کا پانی لانے کے لئے ایک اونٹنی لی تھی جب میں مر جاؤں تو یہ تینوں چیزیں عمر (رضی اللہ عنہ) کے حوالے کر دینا اور ان سے تصدیق کرالینا، گواہ بنالینا کہ ہم نے مسلمانوں کی یہ امانت بھی لوٹادی تھی۔

ان کی وفات کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ تینوں چیزیں لے کر حضرت عمر اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کے پاس آئیں اور انہیں تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حبشی غلام، پرانی چادر اور اونٹنی کو دیکھ کر رونے لگے اور اتنا روئے کہ آنسوؤں نے زمین کو تر کر دیا پھر فرمایا اللہ رحم کرے ابو بکر (رضی اللہ عنہ) پر انہوں نے تو اپنے بعد آنے والے خلفاء کو کتنے تنگ راستے پر چلا دیا (یعنی اتنی احتیاط کسے ہوگی) پھر حکم دیا کہ یہ سامان سرکاری خزانے میں واپس پہنچا دیا جائے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف

ؓ نے کہا سبحان اللہ ایک حبشی غلام، پانی ڈھونے والی اونٹنی اور ایک پرانی چادر جس کی قیمت پانچ درھم سے زیادہ نہیں آپ اسے واپس لے کر کیا کریں گے ؟ حضرت عمر ؓ گویا بے بس نظر آنے لگے اور فرمایا عبد الرحمن تمہی بتاؤ کیا کروں ؟ انہون نے کہا یہ تو ابو بکر ؓ کے گھر والوں کو واپس کر دیں۔ اب حضرت عمر ؓ امیر المؤمنین تھے فرمایا عبد الرحمن اللہ کی قسم جس نے رسول اللہ ﷺ کو سچا دین دے کر بھیجا تھا میرے دور میں مسلمانوں کے ساتھ ایسے نہیں ہو گا کہ وہ مال ذاتی ملکیت بن جائے۔ ابو بکر ؓ تو بوقت وفات ان چیزوں کو سرکاری خزانے میں داخل کرنے کا حکم دیں اور میں یہ سرکاری مال ان کے خاندان کو دے دوں ؟ میں نے بھی مرنا ہے پھر اللہ کو کیا جواب دوں گا[8]۔ یہ عالم ہے اپنے ذاتی اموال کے علاوہ دوسرا مال خرچ کرنے کا۔ سودی معیشت دنیا میں اس وقت بھی رائج تھی مگر اسلاف پر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشی کا حصول اس قدر غالب تھا کہ دنیا اپنی تمام تر رعنائیوں کے باوجود مٹی میں مل گئی تھی۔

آج ہم اپنے آپ کو دیکھیں تو حلال و حرام کی تمیز مٹتی چلی جارہی ہے۔ ایک ایک روپیہ اور ایک ایک پیسہ سود کی گندگی میں لتھڑا ہوا ہے حلال مال کے استعمال اور خورد و نوش سے وسعت ظرفی جنم لیتی ہے انسان اپنے نفس کو مٹانا اور اپنے آپ میں رہنا سیکھتا ہے اور حرام مال تو نمود و نمائش اور کم ظرفی بے صبری کو جنم دیتا ہے۔ جس آدمی کی رگوں میں صحت مند اور بیماری سے پاک خون دوڑ رہا ہوتا ہے اس کی صحت خود اپنی شہادت دیتی پھرتی ہے اور جب خون گندا ہو جاتا ہے تو جسم پر جابجا داغ پھوڑے ار دانے سر ابھارنے لگتے ہیں۔ بالکل اسی طرح آج بھی جہاں حلال مال ہے، صحت مند خون ہے وہاں اعلیٰ ظرفی ہے، وہ لوگ اپنے میں سمائے اور مٹے ہوئے ہیں اور جہاں حرام مال ہے وہاں شادیوں میں سالگرہوں میں ہر ہر موقع پر نمود و نمائش ہے ریاکاری ہے آخر حرام مال اور گندے خون کا اظہار کیسے ہو ؟ کیا حلال کا پیسہ بھی کبھی اسراف کا متحمل ہوا ہے ؟ ہماری زندگیاں اگر بامقصد ہوتیں اور معاشرے سے اچھے افراد پیدا ہو رہے ہوتے تو یہ مسئلہ ہی نہ اٹھتا کہ بینک کے سود کا کیا حل کیا جائے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا بینک کا متبادل ضروری ہے ؟ کیا دنیا میں ہر ایک شر کا متبادل ضرور چاہئے ؟ کیا یہ آسمانی وحی پر قائم شدہ نظام ہے کہ اس میں ردوبدل نہیں کیا جاسکتا ؟ تجارت، لین دین، کاروبار قرضے اس وقت سے تو شروع نہیں ہوئے جب سے بینک قائم ہوئے ہیں۔ دنیا میں یہ معاملات شروع دن سے چلے آرہے ہیں۔ یہ بینک تو چند صدیاں قبل کی پیداوار ہیں۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے بارہ سو سال دنیا کی چھاتی پر مونگ دلی ہے حکومت کی ہے خلافت کا جھنڈا گاڑے رکھا ہے وہ کیسے کاروبار کرتے تھے ؟ دنیا کے دیگر ممالک کے ساتھ ان کی خرید و فروخت کیسے ہوتی تھی ؟ اس پر بھی غور کرنا چاہئے وہ تو ہمیشہ بغیر سود کے نظام چلاتے رہے اور بہترین نظام چلاتے رہے ہم دوسروں کے نظام کے محتاج ہو کر رہ گئے کیا اس لئے کہ ان کی زندگیاں

---

[8] طبقات ابن سعد، جلد، 3، صفحہ، 139

بامقصد تھیں۔ وہ آگ تھے جہاں گئے وہیں کفر اور خدا کی نافرنی کی برف پگھلا کر رکھ دی اور ہم آج بے مقصد زندگی گزارنے کے عادی ہو کر برف بن گئے ہیں اور کفر اور معصیت خداوندی کی آگ ہمارے وجود کو بھاپ میں بدل کر ہوا میں گم کر رہی ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ بس اب قیامت تک پیش آمدہ نئے سے نئے مسائل کا حل اسلام ہی میں ہے۔ زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدلے اور حالات کتنے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں کوئی نئی نبوت نہیں آئے گی تمام مسائل کا حل حضرت خاتم النبیین ﷺ کی لائی ہوئی اس آخری شریعت ہی میں ملے گا۔ سو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں معیشت کا یا فلاں فلاں نئے پیش آمدہ مسائل کا حل نہیں ہے کیا وہ ایک اعتبار سے ختم نبوت کا بھی انکار نہیں کرتے ؟ ان کا کیا خیال ہے کہ العاذ باللہ اب کوئی نیا نبی آنا چاہئے جو ان مسائل کو حل کرے ؟ ابھی تو جنابِ رسول اللہ ﷺ کے سینکڑوں خدام موجود ہیں جو اس جدید معیشت کے بالمقابل ایک مکمل اور بھرپور نظام اپنے ذہن و قلم میں رکھتے ہیں لیکن اس کا کیا کیجئے کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

ہم اپنے نجی معاملات پر غور کریں تو قرض بلاضرورت لین گناہ کبیرہ ہے۔ اس کبیرہ گناہ کا ارتکاب ضروریات اور تعیشات کے فرق کو پیش نظر نہ رکھنے سے عام ہو گیا ہے۔ شادی، غم، نجی معاملات، نام ونمود اور بیسیوں بے کار کاموں کے لئے قرض لیا جاتا ہے فرضی ضروریات گھڑلی جاتی ہیں اور گناہوں کا بوجھ سر پر لدرہا ہے مگر پرواہ ہی نہیں۔ دوسری طرف سرمایہ دارانہ ذہنیت کا حال یہ ہے کہ جس نے قرض لیا ہے خواہ مر رہا ہو مگر اسے مہلت نہیں دینی چاہئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا صاف اور کھلے لفظوں میں یہ حکم ہے کہ

وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿سورۃ البقرہ، ۲۸۰﴾

اور اگر تمہارا قرض دار تنگ دست ہے تو اسے ہاتھ کھلنے تک مہلت دو اور اگر تم سرے سے معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تو وہ ہستی ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اللہ کی قسم کھا کر یہ فرمایا تھا۔

يا معاذ! والله إني لأحبك ﴿ابوداؤد﴾

اللہ کی قسم معاذ تجھ سے محبت ہے

ایک مرتبہ ان پر کاروبار کے سلسلے میں بہت زیادہ قرض ہو گیا اور قرض خواہ تنگ کرنے لگے تو جناب رسول اللہ ﷺ نے ان کے دوستوں کو حکم دیا کہ اپنے دوست کے قرض کو ادا کرو۔ سب نے کوشش کی مگر مطلوبہ رقم مہیا نہ ہو سکی تو جناب رسول اللہ ﷺ نے جمع شدہ رقم قرض خواہوں کو دیتے ہوئے فرمایا۔

خذوا ما وجدتم و ليس لكم إلا ذلك" . یہ رقم تم آپس میں تقسیم کرلو اور اس کے علاوہ اب تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔
رواہ مسلم .

قرض کے تفصیلی احکامات تو فقہی کتابوں میں دیکھ لئے جائیں مگر ہم متعلقہ آیات و احادیث کی روشنی میں اپنا طرزِ عمل بھی تو دیکھیں کہ کیا کرتے ہیں؟ پھر قرض تو ایک بات ہے ذہنیت اس قدر سرمایہ دارانہ ار سودی بن گئی ہے کہ اچھے اچھے دیندار حضرات جو نماز روزہ حج ہر سال عمرہ تک کی سعادت سے مشرف ہوتے ہیں کاروبار میں طے یہی کریں گے کہ نفع و نقصان دونوں میں شراکت ہو گی مگر جب نقصان کی اطلاع ملتی ہے تو ایک دن کے لئے برداشت نہیں کرپاتے اور اصل زر کی واپسی کے لئے بھی ایسے شدید تقاضے جیسے زندگی اور موت اسی رقم پر موقوف ہو کر رہ گئی ہے اور اگر نفع ملتا رہے تو برسہا برس تک کوئی پرواہ نہیں۔ سو عملی زندگی میں یہ رویہ کہ نفع پر رضامندی اور نقصان میں شرکت نہ کرنا کیا یہ سودی ذہنیت نہیں ہے؟ اس وقت اسلام کی معاشی تعلیمات عمل کے لئے کیوں سامنے نہیں آتیں؟ اس لئے کہ زندگی بامقصد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہیں اپنے نفس کے ساتھ پرستش کا تعلق ہے۔

جانتا ہوں یہ امت حامل قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں

کیا تجارت اور معیشت اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ آپ اس میدان میں کام کریں مگر اسے صرف ذریعہ اور واسطہ ہی رکھیں، منزل مقصود نہ بنائیں وہ تو بس صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے "اللہ تعالیٰ کی خوشی اور رضا"

جہاد

اسلاف کی زندگیاں اس مقدس کام کے لئے وقف تھیں وہ اپنا لہو بہا کر، سر کٹا کر اور جسم تیروں، تلواروں، نیزوں سے داغ داغ کرا کر زمین پر سر فخر سے بلند کر کے آسمان کے ہم پلہ ہو کر چلتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنا تھا اس کے لئے جان کا نذرانہ پیش کرنا تو کوئی بات ہی نہ تھی ان کی موت دلیل حیاتِ جاوداں اور ان کی قبریں وفائے عہد کے درخشندہ نشاں۔

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں
یہ مزار اہل صفا کے ہیں یہ ہیں اہل صدق کی تربتیں

ان کے مبارک دور میں فوجی اور سیاسی قیادت کا الگ الگ تصور ہی نہ تھا جو حکمران وقت تھا وہی فوج کا سربراہ تھا جو امیر المؤمنین تھا وہی چیف آف آرمی سٹاف تھا۔ آئندہ آنے والا مورخ جب امت مسلمہ کے زوال کے اسباب مرتب کرے گا

تو برصغیر کے بارے میں یہ بھی لکھے گا کہ یہاں انگریزی دور حکومت ہی میں یہ رسم چلی کہ دونوں قیادتیں (سیاسی اور فوجی) الگ الگ ہوئیں وگرنہ دور عروج کی آخری یادگار برصغیر کا مجاہد و آخری تاجدار محی الدین سلطان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے دور تک قیادت ایک ہی تھی۔ جو خلیفہ تھا سو وہی سالار لشکر تھا۔ جہاد تو اکابر کی گھٹی میں پڑ گیا تھا اور اس نشے میں ایسے مست و سرشار تھے کہ حضرت عبداللہ بن حر ؓ جو مجاہد تھے اور کئی ایک معرکوں میں شریک رہے، حضرت عمر ؓ کے دور خلافت میں شام میں زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر کھیتی باڑی میں مصروف ہو گئے۔ زراعت کوئی برائی نہ تھی جس پر عتاب ہوتا مگر امیر المؤمنین حضرت عمر ؓ کو جہاد چھوڑ کر زراعت میں لگ جانا اتنا ناگوار گذرا کہ فرمایا بڑے سرمایہ داروں کی گردنوں میں جو ذلت اور حقارت کا طوق تھا، جہاد چھوڑ کر اس طوق کو تم نے اپنے گلے ڈال لیا۔ اور پھر ان کی زمین ضبط کر لی[9]۔

جہاد میں پسپائی اختیار کرنا اور لوٹ آنا کس قدر شرمندگی کا باعث تھا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غزوہ موتہ میں اگرچہ جنگی حکمت عملی کے تحت مسلمانوں کو ایک جگہ پیچھے ہٹنا پڑا اور جو پیچھے ہٹے وہ شرعاً گنہگار نہ تھے مگر حضرت ابوہریرہ ؓ (جو پیچھے ہٹنے والوں میں سے تھے) فرماتے تھے ایک مرتبہ میری اپنے چچازاد بھائی سے کچھ بات ہو گئی اور جب معاملہ بڑھا تو اس نے کہا کیا تم وہی نہیں ہو جو غزوہ موتہ میں پیچھے ہٹ گئے تھے؟ تو اس بات کے جواب میں مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اسے کیا کہوں[10] آپ اس کے بعد کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں کیا جہاد بھی کبھی اس امت میں ختم ہوا ہے؟ کیا کبھی اسے ختم کرنے کا سوچا جاسکتا ہے؟ اس امت کی آبرو اور بقا کا ضامن جہاد ہی ہے۔ امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے برصغیر میں جب یہ فریضہ عملاً ساقط ہو رہا تھا اس کی تجدید فرمائی اور اسے زندہ کیا۔ بدر سے لے کر بالاکوٹ تک اور غزوہ خیبر سے لے کر معرکہ حطین تک کی زریں و تابناک تاریخ جن کے اسلاف کی روایت ہو وہ کیسے جہاد کو چھوڑ سکتی ہے؟ حضرت عمرو بن العاص ؓ نے جب مصر فتح کیا تو اپنی فوج اور مجاہدین کو مخاطب کر کے ایک ایسا تاریخی جملہ کہا جو لوح دل پر نقش کر لینے کے قابل ہے۔ ایک مسلمان مجاہد کو ہمیشہ اس جملے کی روشنی میں اپنا جائزہ لینا چاہئے۔ فرمایا" اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم ہمیشہ محاذ جنگ پر ہو اور تمہارے چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں اور ان کے دل تمہاری تباہی کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہتے"[11] مومن کی تو تمام زندگی ہی محاذ جنگ ہے۔ داخلی اور خارجی دونوں میدانوں میں جہاد کا علمبردار انتھک مجاہد

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں

---

[9] الاصابہ، جلد3، صفحہ، 88
[10] ابو نعیم و طبرانی
[11] ابن اثیر

کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی[12]

صلیبی جنگوں کے قائد (Hero) امت مسلمہ کی آبرو بطل جلیل اور بیت المقدس کا فاتح سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ، جہاد کی کوئی بھی تاریخ اس دل کش و من موہن عنوان کے بغیر ناقص اور ادھوری ہے۔ سلطان نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کی حکومت تھی بیت المقدس کو کھوئے ہوئے اور شکست کھائے ہوئے 90 برس کا عرصہ گزر چکا تھا وہ جو قبلہ اول تھا اذان کی آواز سے اس کے کان نا آشنا ہو چکے تھے کہ اچانک صلاح الدین ایوبی کو خلیفہ وقت نے مصر کی حکمرانی سونپ دی۔ جب وہ مصر پہنچے تو فرمایا " جب مجھے اللہ نے مصر دیا تو میں سمجھ گیا کہ اب مجھے فلسطین دینا بھی اللہ کو منظور ہے۔

کہاں لہو و لعب کی زندگی اور شراب کی مستی اور کہاں اب یہ حال ہو گیا کہ سب گناہوں سے منہ پھیر لیا اور جفاکشی کی زندگی اختیار کر لی۔ معرکہ حطین (583ھ بمطابق 1187ء) جس نے فلسطین میں عیسائی حکومت کی جڑ اکھیڑ دی اور صلیبیوں کی کمر توڑ دی اس سے پہلے حال یہ ہے کہ ان کے سیکرٹری ابن شداد " النوادر السلطانیہ " میں لکھتے ہیں۔

میدان جنگ میں ان کی کیفیت ایسی دکھیاں جیسی ہوتی تھی جس کا اکلوتا بیٹا کہیں مر گیا ہو۔ وہ ایک صف سے دوسری صف تک اپنے گھوڑے پر دوڑتے پھرتے اور لوگوں کو جہاد کی دعوت دیتے تھے۔ اپنی فوج میں بار بار چکر لگاتے اور فرماتے۔

یاللاسلام دوستوں اسلام کو بچاؤ، اس کی مدد کر۔

اور یہ کہہ کر رو دیتے۔

اور پھر حطین کے بعد آخر وہ دن بھی آیا جس کی انہیں تمنا تھی جس وجہ سے انہیں اللہ نے چن کر مصر کی حکومت دی تھی بیت المقدس کو 90 سال کے بعد جہاد برپا کر کے بزور شمشیر حاصل کر لیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی جو تاریخ معراج تھی اور کبھی وہ آسمانوں کی بلندی طے فرمانے یہاں تشریف لائے تھے، حسنِ اتفاق کہ صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی دن مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے۔ جمعہ کی نماز ادا فرمائی اور ان کا چہرہ، داڑھی، سجدہ کی جگہ سب شکر اور خوشی کے آنسوؤں سے تربتر تھی۔

---

[12] کلیات اقبال، بانگ دراء، زیر عنوان شکوہ، صفحہ، 64

بیت المقدس کی فتح اور معرکہ حطین کی شکست نے یورپ کے اوسان خطا کر دیے۔ شام پر پورا یورپ حملہ آور ہوا۔ صلیبی جنگوں میں شرکت کے لئے قیصر، فریڈرک، رچرڈ، انگلینڈ، فرانس، اور آسٹریا کے تمام بادشاہ اپنی افواج سمیت بار بار آئے اور جس مرد آہن سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے تھے وہ ان سب کے مقابلے میں اکیلا تھا سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ۔

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سربکف

شام و حجاز مقدس سے ادھر نگاہ کیجئے تو یہ ہیں با مقصد زندگی گزارنے ولے غوری اور غزنوی۔ سلطان شہاب الدین غوری کو جب پہلی جنگ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے قسم کھالی کہ بستر پر نہیں سوئے گا اور جن سرداروں کی وجہ سے یہ ذلت کا دن دیکھنا پڑا تھا ان کے منہ پر گھوڑوں کے توبرے چڑھوا دیے۔ پھر وہ غیرت تھی جس نے آئندہ برسوں میں اسے غور سے دہلی اور اجمیر تک کا حکمران بنا دیا۔

ہم نے جہاد کے فریضے سے کیوں منہ پھیر لیا ہے؟ کیا ہم ایسے ہو گئے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ ٱنفِرُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱثَّاقَلْتُمْ إِلَى ٱلْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُم بِٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا مِنَ ٱلْـَٔاخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَـٰعُ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فِى ٱلْـَٔاخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ

﴿سورۃ التوبہ،۳۸﴾

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تمہیں اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسے ہے تو پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دنیوی زندگی کا یہ تمام اسباب و سامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔

یا ان میں شامل ہیں جن کی مذمت ایک دوسرے مقام پر یوں فرما کر کی گئی ہے۔

رَضُوا۟ بِأَن يَكُونُوا۟ مَعَ ٱلْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ

﴿سورۃ التوبہ،۸۷﴾

یہ لوگ (جہاد کو چھوڑ کر) گھر بیٹھنے والیوں (عورتوں) میں شامل ہو کر خوش ہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اس لئے اب ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

کیا ہم نے کبھی اللہ تعالیٰ کی یہ قہر آمیز بات نہیں سنی اور وہ ذات جو اپنے کہے کو پورا بھی کر سکتی ہے کہ

وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ ٱئْذَن لِّى وَلَا تَفْتِنِّى ۚ أَلَا فِى ٱلْفِتْنَةِ سَقَطُوا۟ ۗ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌۢ

تم جہاد کے لیے نہ اٹھو گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور

بِالْكٰفِرِينَ ﴿سورۃ التوبہ،۴۹﴾ تم اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔

کیا اس سے بھی زیادہ کوئی سخت آیت نازل ہوتی تو ہم جہاد کے لئے اٹھتے جن کے دل میں ایمان کی ادنی سی حرارت اور آخرت کا موہوم سا بھی تصور ہے ان کو لرزا دینے کے لئے بس یہی آیت کافی ہے۔

جہاد تو اللہ کو خوش کرنے کا راستہ ہے اور بامقصد زندگی گزارنے والوں کی جادہ راہ، اگر ہماری زندگی بھی بامقصد ہے تو پھر ہم اس راہ کو کیوں نہ اپنالیں؟ مشرقی پاکستان کے سقوط کا کیا ہوا؟ اگر آج بھی جہاد زندہ ہوتا تو کیا اس کا بدلہ نہ اتر جاتا۔ وہاں ہزاروں مسلمانوں کا خون محض اس لئے بہہ گیا کہ وہ پاکستان کے ساتھ متحد رہنا چاہتے تھے۔ ان کے اس " جرم وفا" کی اتنی بھیانک سزا اور باقی رہ جانے والوں کی اتنی بے حسی ایک مشرقی پاکستان ہی کیا کشمیر، فلسطین، بوسنیا اور برما میں کیا کفر اور اسلام کی جنگ نہیں ہے۔ ہم کس انتظار میں ہیں؟ جن کی زندگیاں بامقصد ہوا کرتی ہیں وہ تو ان مواقع کو قدرت کی عطاء بے انتہا جانتے ہیں۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل
اس کی زمین بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل[13]

ایسے مجاہدوں کے کندھے تو سر کی امانت اس کے مالک پہنچانے کو بے تاب رہتے ہیں اور ان کے وجود ان کی ادائیں اور ان کے عزائم زبان حال سے پکار پکار کر یہ پیغام دیتے پھرتے ہیں کہ

مال و زر و دل و جگر، کردے سبھی کو وقفِ در
بندگی ار بقید سر، ننگ ہے بندگی نہیں

اخلاقیات

اس امت کے خمیر میں انسانی جذبات کا احترام اور اخلاقی اقدار کا ایک بہت بڑا حصہ شامل ہے۔ اسلاف جس طرح اس زندگی کو بامقصد جانتے تھے جس میں ظاہری گناہوں سے پرہیز اور اطاعت الٰہی شامل ہو بالکل اسی طرح وہ اخلاق کے معاملے میں بھی باطنی گناہوں کو مہلک اور معصیت خداوندی شمار کرتے تھے۔ ان کے ہاں ایک بامقصد مسلمان کی زندگی میں

---

13 کلیات اقبال، صفحہ نمبر 388

یہ بات شامل تھی کہ اپنے بڑوں کا ادب کرے اپنے چھوٹوں سے شفقت سے پیش آئے اور غیبت، چغلی، حسد، کینہ، دھوکہ دہی اور جھوٹ سے مکمل پرہیز کرے۔ وہ جس طرح ان گناہوں سے بچنے اور بچانے والے تھے جن کا ارتکاب جسم کرتا ہے اسی طرح ان گناہوں سے خود بھی دور رہتے تھے اور اپنے رفقاء کو بھی ان سے دور رکھنے کی جدوجہد کرتے تھے جن کا ارتکاب روح کرتی ہے اور وہ بسا اوقات ظاہری گناہوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ ہمدردی، سخاوت، وفاء عہد اور دوسروں کے حقوق و فرائض کو ادا کرنا ان کی بامقصد زندگیوں کا خاصہ تھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ کے اخلاق عالیہ کی تعریف میں خود اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیمٍ ﴿سورۃ القلم، ۴﴾ اور بے شک آپ اخلاق کے بہت بلند مرتبے پر ہیں

اس لئے اخلاقی اقدار تو بس وہی ہیں جو خود انہوں نے مرتب فرمائی ہیں تلقین کی ہیں یا عمل کر کے دکھایا ہے اہل ایمان کے ساتھ نرمی اگر اخلاقیات کا حصہ ہے تو کفار کے ساتھ سختی بھی اخلاقیات ہی میں شامل ہے۔ مظلوم کا ساتھ دینا اچھی اقدار کا ثبوت ہے تو ظالم کو سزا دینا بھی انہی اقدار حسنہ کا خاصہ ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ اپنے رفقاء اور اصاغر کے معاملے میں اس قدر شفیق تھے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ یہودیوں کے قبیلے بنو قریظہ کے معاملے میں فیصلہ کرنے کے لئے تشریف لائے تو آپ نے انہیں گلے لگالیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک زخم تھا جس سے خون فوارے کی طرح بہنے لگا اور اس خون کی دھار آپ کے چہرہ مبارک اور داڑھی پر پڑ رہی تھی مگر آپ نے انہیں محبت اور شفقت کی وجہ سے اپنے جسم مبارک سے الگ نہیں کیا اور الگ کرنا تو درکنار حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کوئی جنابِ رسول اللہ ﷺ کو اس خون کی دھار سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور آپ اتنے ہی زیادہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے چمٹ رہے تھے[14]۔

یہ ہے اخلاق عالیہ کی تعلیم کہ جس نے کسی مقصد کے لئے جس قدر قربانی دی ہو اس سے شفقت و محبت کا یہ برتاؤ اور اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا جائے۔

یتیموں کے ساتھ کیا سلوک تھا؟ حضرت بشیر بن عقربہ رضی اللہ عنہ کے والد غزوہ احد میں شہید ہو گئے تو آپ نے انہیں بلا کر ان کے والد کی شہادت کی اطلاع دی تو وہ رو پڑے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنے ساتھ چمٹالیا ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور یہ کہتے ہیں کہ مجھ سے فرمایا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ میں تمہارا باپ بن جاؤں اور عائشہ (رضی اللہ عنہا) تمہاری ماں ہوں۔ اور پھر

[14] طبقات ابن سعد، جلد، 3، صفحہ، 426

مجھے اپنے ساتھ سواری پر بٹھالیا[15]۔ انہی اقدار پر صحابہ کرام ﷺ کی تربیت ہوئی تھی۔ چراغِ نبوت سے جنہوں نے روشنی حاصل کی تھی وہ بھی اسی سانچے میں ڈھل گئے تھے۔

حضرت عمر ؓ دستر خوان پر تشریف فرما تھے اور مہمانوں کے لئے کھانا چنا جارہا تھا۔ اس موقع پر حضرت عمرو بن طفیل ؓ بھی حاضر تھے جن کا ایک ہاتھ جنگ یمامہ میں کٹ گیا تھا۔ جب کھانے کی ابتدا ہوئی تو یہ حضرت عمر ؓ کے قریب سے اٹھ گئے۔ وہ فوراً اس بات کو بھانپ گئے اور فرمایا عمرو (ؓ) تم اپنے ہاتھ کی وجہ سے کھانے سے اٹھ گئے ہو۔ انہوں نے جواب دیا جی ہاں تو حضرت عمر ؓ نے فرمایا ایسے نہ کرو۔ اللہ کی قسم میں اس کھانے کو چکھوں گا بھی نہیں جب تک کہ تم اس کھانے کو دوسرے ہاتھ سے کھانا نہ شروع کرو اللہ کی قسم اس پورے مجمع میں تمہارے علاوہ کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا کوئی ٹکڑا جنت میں پہنچ چکا ہو۔ پھر انہوں نے بھی کھانا کھایا اور بعد میں غزوہ یرموک میں انہیں مقامِ شہادت نصیب ہوا[16]۔

معذوروں کے ساتھ شفقت کا یہ رویہ اور انہیں یوں خوشخبری سنانا یہ انہی کا حصہ تھا جن کی زندگیاں بامقصد اور عادات اخلاق نبوی علیہ الصلوۃ والسلام سے مستنبط تھیں۔ اپنے معاصرین اہل علم اور جن کی بزرگی مسلم تھی ان کے حقوق کے کیسے محافظ تھے اس کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

کوفہ میں ایک شخص کو حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے فرمایا کہ تہبند اونچا باندھا کرو تو اس نے منہ در منہ بات کی اور کہا کہ آپ بھی اونچا باندھا کریں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں معذور ہوں اور پھر اپنا عذر بھی بیان کر دیا۔ دور اور زمانہ حضرت عمر ؓ کی خلافت کا تھا۔ یہ خبر شدہ شدہ مدینہ طیبہ پہنچی اور حضرت عمر ؓ سن کر خاموش ہو گئے۔ یہ اعتراض کرنے والا آدمی ایک مرتبہ مدینہ طیبہ آیا تو اس نے اپنا تعارف حضرت عمر ؓ سے کروایا۔ آپ کے ذہن میں یہ بات پوری طرح گھر کر چکی تھی کہ اگر وہ معترض کبھی ملا تو اسے ادب سکھانا ہے۔ جب یقین ہو گیا کہ یہ وہی شخص ہے تو آپ نے درے سے اس کی خبر لینی شروع کی اور مارنے کے ساتھ بار بار یہ فرمایا کہ ابن مسعود (ؓ) کی بات کو رد کرتا ہے؟ تو انہیں جواب دیتا ہے؟[17] یہ تو ہے ادب سکھانا اور تعلیم کہ بسا اوقات ایک عام آدمی اور کسی اللہ کے مقرب بندے کا فعل ظاہراً ایک جیسا ہوا کرتا ہے مگر دونوں کی حقیقت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ظاہراً اعتراض کرنے والا صرف اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے کی بجائے اپنی عقل کو ناقص اور کامل کے فعل کو مکمل تسلیم کرلے تو کچھ ادب اور انسانیت سیکھ سکتا ہے۔ یہ بھی پڑھ لیجئے کہ چھوٹوں کو اپنے اکابر پر کیسا اعتماد اور ان کا کتنا احترام ان کے دلوں میں جاگزیں تھا۔

---

[15] الاصابہ، جلد، 1، صفحہ،153
[16] ابن سعد
[17] کنز العمال، جلد،7، صفحہ،55،

یمن کے محدث حضرت طاؤس بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے تھے کہ ایک حج کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلبیہ پڑھ رہے تھے اور سب لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، کوچ کرنے کا وقت آچکا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلبیہ مسلسل پڑھتے جارہے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی پاس کھڑے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کوچ کا وقت ہو چکا ہے۔ پاس ہی سے ایک آدمی بولا کہ کیا چلنے کا وقت نہیں ہو گیا؟ تو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے صرف اتنا فرمایا کہ مجھے علم نہیں۔

یہ لاعلمی کا اظہار کیوں؟ اس لئے نہیں کہ وہ مسئلہ نہیں جانتے تھے اس لئے کہ یہ جملہ یا اس کا جواب امیر المؤمنین کے کان میں پڑ گیا تو اس وقت جو ان کی کیفیت تعلق مع اللہ ہے اس میں خلل واقع ہو سکتا ہے۔ وہ اگر کھڑے ہیں تو کسی مصلحت ہی سے کھڑے ہوں گے۔ وہ خود مسائل جانتے ہیں ہمیں تو ان کے پیچھے چلنا ہے اور ان کا ادب کرنا ہے اس بات کے پیش نظر انہوں نے اس شخص کو صرف یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ مجھے علم نہں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس ادب واحترام پر بہت تعجب ہوا[18]۔

یہ تھے اسلاف جنہوں نے اخلاقیات کو برت کر دکھایا اور نمونے قائم کئے۔ بامقصد باادب زندگی نے انہیں جہاں کی سعادتوں سے بہرہ ور کیا انہوں نے پوری دنیا میں انسانیت کی شمع روشن کی اور اخلاقی اقدار کا عملی سبق سکھایا۔

اب ہمارے ہاں فقط اخلاقیات اور اقدار کا پرچار رہ گیا ہے۔ غصہ پر ہمیں قابو نہیں۔ دوسروں کی عیب چینی سے ہمیں فرصت نہیں۔ اپنے مزاج کے خلاف بات اگرچہ درست ہی کیوں نہ ہو ہمیں نہیں بھاتی۔ غیبت کے بغیر شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو۔ اپنے نفس پر قابو تو درکنار کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ کتنا بڑا دشمن ہے جو پہلو ہی میں موجود ہے۔ تو پھر آخر کس طرح زندگی بامقصد بنے اور کس طرح اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو۔ اسلاف کی سیرت و کردار اپنانا تو درکنار علم تک نہیں ہے کہ وہ کیسے تھے ہم کیا ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں نمونہ بنا کر بھیجا اور ان کی زندگیاں ہمارے لئے مشعل راہ تھیں۔ ہم اپنے کردار میں ایسے پست ہوئے کہ بقول علامہ اقبال مرحوم کے[19]

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں　　امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں　　تھا ابراہیم پدر اور پسر آذر ہیں

بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا، بت بھی نئے تم بھی نئے

---

18 منتخب کنز العمال، جلد،5، صفحہ،329

19 کلیات اقبال، بانگ دراء زیر عنوان جواب شکوہ، صفحہ، 200

مسئلے کا حل

مسئلے کا حل یہی ہے کہ سب سے پہلے تو ہم اپنی زندگی کا مقصد متعین کریں کہ کیا کرنا ہے اور کس لئے کرنا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی رضا ہی مقصود زندگی ہے تو پھر شریعت کی پابندی کو طرز عمل بنالیں یہ طے کرلیں کہ جس حد تک ہو سکے گا پوری کوشش کرکے اپنے عقائد، اعمال اور اخلاق شریعت کے مطابق بنائیں گے۔ گناہ کی ذلت سے اپنے آپ کو ہر ممکن حد تک محفوظ رکھیں گے۔ یہ بحث کہ فلاں گناہ صغیرہ ہے اور فلاں کبیرہ اگرچہ اپنے مقام پر درست مگر نشیمن جلانے کے لئے ضروری نہیں کہ آگ کا الاؤ ہی ہو بسا اوقات ایک چنگاری بھی قیامت برپا کر دیتی ہے۔ اپنا وجود اور اپنی عقل شریعت کے حوالے کر دیں گے بس جس موقع پر سختی مطلوب ہے وہاں سخت رہیں گے اور جن مواقع پر نرمی مطلوب ہے وہاں نرم پڑ جائیں گے۔ اسلاف واکابر میں سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ ان کی صبح سے لے کر شام اور شام سے لے کر صبح تک کی زندگی سنت کے مطابق تھی[20]۔

رہ حق میں تھی دوڑ اور باگ ان کی — فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ ان کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی — شریعت کے قبضے میں تھی باگ ان کی

جہاں کر دیا نرم، نرما گئے وہ
جہاں کر دیا گرم، گرما گئے وہ

ہم یہ طے کرلیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مقابلے میں ہمارا وجود، ہماری رائے، ہماری عقل و دانش اور تدبیر و تجویز کچھ نہیں ہے۔ ان کی حقیقت کالعدم ہے اور یہ تمام چیزیں پرکاہ کے برابر ہیں۔ رضائے باری تعالیٰ ہی اصل ہے اور اسے ہی حاصل کرنے کے لئے زندگی کے دکھ سکھ اور موت کی تکالیف و مسرتیں ہیں۔ ہم اپنے جسم وروح سے سرزد ہونے والے تمام اعمال پر شریعت ہی کی بالادستی قائم کریں گے۔ امیر المؤمنین سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عالم تھا کہ ان کے ایک معتقد جو پٹنہ میں رہتے تھے ان کے لئے سال میں تین سو ساٹھ جوڑے کپڑے تیار کروا کر بھیجا کرتے تھے تاکہ وہ روزانہ نیا لباس پہنیں۔ شہادت سے چند دن قبل حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا لوگو اگرچہ میں روزانہ نیا لباس پہنتا ہوں مگر اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہو کہ میں کمبل کا (موٹا) لباس پہنوں اور بھینس کے گوبر میں دھنس جاؤں تو بندے کا کام یہ ہے کہ اللہ کی رضا میں راضی رہے۔ ان کے ایک پٹھان مرید نے یہ سن کر کہا" کیا ہم سے تم جدا ہونا چاہتا ہے یہ کیا معاملہ ہے کہ بار بار ایسا کلمہ کہتا

20

ہے"۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا واقع میں بندے کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ہر حالت میں تیار رہنا چاہئے [21]۔

شریعت نبی کریم ﷺ کی صحبت طیبہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حاصل کی تھی۔ پھر ان سے تابعین نے اسے سیکھا پھر ان کی صحبت سے تبع تابعین اس نور سے منور ہوئے اور پھر ان سے لے کر آج تک یہ سلسلہ جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی صحبت سے عقائد کی اصلاح، علوم میں برکت اور اعمال میں روحانیت آتی ہے اس لئے یہ از حد ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک اور مقرب بندوں کی مجلس اختیار کی جائے۔ ان سے اخلاقیات کا اعلیٰ درس حاصل کیا جائے اور زندگی کو شریعت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جائے۔

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمد (ﷺ) سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

21